حالؔی: حقوقِ نسواں کے اوّلین ترجمان

عبدالشکور شاکر
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو
گورنمنٹ کالج، سیٹلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ

HAALI: THE PIONEER ADVOCATE OF WOMEN'S RIGHTS IN URDU LITERATURE

Abdul Shakoor Shakir
Assistant Professor of Urdu
Govt. College Satellite Town, Gujranwala

Abstract

Haali is a great poet and critic of Urdu. He has earned fame and distinction owing to writing on novel topics and presenting diversified notions and thoughts. One of these concepts is his views about women which occupy a prominent place in both of his poetry and prose. Haali was a social reformer and a soft hearted man who was highly compassionate towards women. He was desirous of replacing the backward condition of women with progress and prosperity. He had tried to get back the lost status of women by his writings.

Keywords:

حالؔی، حقوقِ نسواں، تاریخ، عرب، ہندوستان، معاشرتی حالت، سیاسی زوال، استحصال، حقوق وفرائض، مساوات مرد وزن، مُناجاتِ بیوہ، چُپ کی داد

خواجہ الطاف حسین حالؔی اردو کے ایک ممتاز ادیب، شاعر اور نقاد ہیں۔ انھیں ادب میں متعدد نئے موضوعات پر لکھنے اور مختلف النوع افکار و تصورات پیش کرنے کے حوالے سے اولیت حاصل ہے۔ ان میں سے ایک موضوع طبقۂ نسواں کا ہے جسے انھوں نے نثر و نظم دونوں میں اہمیت دی ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی کی اردو شاعری میں حقوق نسواں کی ترجمانی کے موضوع پر کچھ لکھنے سے پہلے مختصراً بیان کرنا ضروری ہے کہ ان کے دور میں اور ان سے قبل ہندوستان کے طبقۂ نسواں کی معاشرتی حالت کیسی تھی اور ہندوستانی سماج میں اس کا مقام و مرتبہ کیا تھا۔

ہندوستان کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت مدتِ دراز سے مظلوم چلی آرہی تھی اور اس کا ہر معاملے اور ہر سطح پر استحصال ہو رہا تھا۔ وہ ہر ملک میں معتوب تھی۔ ہندوستان ہو کہ ترکستان؛ روم ہو کہ مصر؛ چین ہو کہ یونان؛ عراق ہو کہ ایران؛ یورپ ہو کہ عرب، ہر جگہ وہ مظلوم تھی اور ہر کہیں اس سے ناانصافی ہو رہی تھی۔ معاشرت میں اسے مرد کے مساویانہ مقام دینے کے بجائے اس سے جانوروں کا سا رویہ اختیار کیا جاتا اور توہین آمیز سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ مختلف زمانوں میں مرد اور عورت کی سماجی حیثیت اس قدر مختلف تھی کہ وہ کوئی دوسری جنس معلوم ہوتی تھی۔ دونوں میں تفریق کی ایسی خلیج حائل تھی کہ گویا دو مختلف النوع مخلوق ہوں۔

یونان میں ایک عرصہ تک یہ بحث ہوتی رہی کہ عورت ذات میں روح ہے بھی یا نہیں۔ اہل عرب اس کے وجود ہی کو موجبِ عار سمجھتے تھے، ہندوستان میں مرنے والے شوہر کی چتا پر اس کی بیوہ کو جلا دیا جاتا تھا، راہبانہ مذاہب اسے معصیت کا سرچشمہ اور گناہ کا دروازہ مانتے تھے اور عورت سے تعلق کو روحانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ جانتے تھے۔(۱) قدیم یونان و روم نے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں ترقی کے باوجود عورت کو ہمیشہ پس ماندہ رکھا۔ ترقیات کے باوصف ان کے ہاں عورت کا مقام بہت ہی پست تھا۔ عورت کا مقصد ان کے نزدیک سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ وہ غلاموں اور خادمہ کی طرح اہلِ خانہ کی خدمت گزاری کرتی رہے۔(۲) یورپ جہاں متعدد سیاسی و معاشرتی اور علمی و معاشی تحریکیں پیدا ہوئیں اور جن کے نتیجے میں وہ آج مساواتِ مرد و زن کا سب سے بڑا دعویدار ہے، اسی یورپ میں ایک (دو) صدی سے کچھ پہلے تک عورت، مرد کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی اور وہاں کوئی ایسا مضبوط قانون نہ تھا جو مرد کو عورت سے زیادتی و ناانصافی سے روکتا (۳) علاوہ بریں عورت کو مرد کے ہاتھوں استحصال بالجبر سے بچاتا اور اسے ریاست کا معزز شہری ہونے کا حق دار ٹھہراتا۔

غیر متمدن عرب کی صورتِ حال بھی بہت دگرگوں تھی، وہاں بھی عورت مجبور و ناچار تھی اور اسے مرد کے مساوی درجہ حاصل نہ تھا۔ عربوں کے نزدیک عورت کا وجود واجب التکریم ہونے کے بجائے باعثِ شرم تھا۔

ان کے ہاں لڑکوں کی پیدائش خوشی اور عزت کا سامان لے کر آتی جبکہ لڑکیوں کے جنم لینے پر گھر کی فضا سوگوار ہو جاتی۔ خاندان کا ہر فرد افسردہ وغمزدہ ہو جاتا اور بچی کی پیدائش کو صیغہ راز میں رکھتا۔ اسی صورتِ حال کی عکاسی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس پیرائے میں کی ہے:

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِیْمٌ o یَتَوَارٰی مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَیُمْسِكُهٗ عَلٰی هُوْنٍ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ

(النحل:۵۸۔۵۹)

ترجمہ: ''جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا اور وہ غم میں گھلنے لگتا ہے۔ اس خبر کو وہ اسقدر بُرا محسوس کرتا ہے کہ خود کو اپنی قوم سے چھپائے پھرتا ہے کہ آیا وہ ذلت سہتے ہوئے اسے زندہ رکھے یا زیرِ زمین دفن کر دے۔''

کتبِ تواریخ میں منقول ہے کہ قبل از اسلام عرب میں لوگ بچیوں کو ان کی پیدائش کے فوراً بعد شماتت کے سبب زندہ درگور کر دیتے تھے کیونکہ وہ کسی غیر مرد کو اپنا داماد بنانا پسند کرتے تھے نہ بہنوئی۔ عورت کی حیات کو موت سے بدلنے کی تلخ داستان کا بیان ان الفاظ میں قرآن حکیم میں ہوا ہے:

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ o بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (التکویر:۸،۹)

''یعنی جب زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ اسے کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا۔''

عربوں کی اسی مذموم رسم کی نقشہ کشی مولانا حالی نے اپنی مسدس مدوجزر اسلام کے ان اشعار میں عام فہم پیرایے میں کی ہے:

جو پیدا کسی گھر میں ہوتی تھی دختر
تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی تھی جو شوہر کے تیور
کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

جہالت وشقاوت کی ظلمت میں چھپی اسی مکروہ تہذیب پر مسدس میں حالی نوحہ کناں ہوئے:

نہاں ابرِ ظلمت میں تھا مہرِ انور
اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر

برعظیم ہند کی سماجی حالت بھی دوسرے ممالک واقوام سے کوئی زیادہ مختلف نہ تھی۔ یہاں بھی عورت ذلیل وحقیر مخلوق گردانی جاتی تھی۔ یہاں بھی لڑکوں کی پیدائش پر شادیانے بجائے جاتے جبکہ لڑکیوں کے جنم لینے پر بین کیے جاتے تھے۔ بچیوں کی ولادت پر باپ کا منہ لٹک جاتا، پیدائش سے قبل جو باپ بیٹے کی اُمید میں خوشی کے جذبے سے سرشار ہوتا تھا، وہی غیر فطری ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے آتش بجاں ہو جاتا کیونکہ ہندو سماج میں لڑکیوں کے جنم کو پورے کنبے کے لیے منحوس خیال کیا جاتا اور موجبِ عار قرار دیا جاتا تھا۔

ہندو تہذیب اپنی قباحتوں کی بنا پر پوری دنیا میں رسوا اور ہدفِ تنقید بنی رہی ہے، بالخصوص عورت ذات کے حوالے سے۔ اسی موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر عبدالغنی رقمطراز ہیں:

> ''ہندو تہذیب خواہ قدیم ہو یا جدید، عورت کے لیے اپنے ہاں کوئی باعزت مقام نہیں رکھتی۔ ہندو معاشرے میں مرد اس کا سوامی اور اس کا شوہر مالک اور معبود کا درجہ رکھتا ہے۔ اسے بچپن میں باپ کی، جوانی میں شوہر کی اور بیوہ ہونے کی حالت میں اولاد کی مملوکہ بن کر رہنا پڑتا ہے۔ انگریز راج سے پہلے ہندوؤں میں ستی کی رسم مروج تھی جس کے مطابق جب کسی شادی شدہ عورت کا خاوند فوت ہو جاتا تو اس مظلومہ کو اپنے خاوند کے ساتھ چتا میں جلنا پڑتا۔ ہندو مت میں عورت اپنی رضا و رغبت کے بغیر ہی جب ایک دفعہ مرد کے نکاح میں آجائے تو مرد خواہ کیسا بھی ہو، آخری دم تک اس کے چنگل سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی۔ علاوہ ازیں یونانی تہذیب کی طرح ہندو تہذیب میں بھی اسے اخلاقی گراوٹ اور گناہ کا مجسمہ سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف عورت کو بہیمی خواہشات کا کھلونا بنا لیا گیا۔ اس کے ساتھ اس قدر رسوا کن سلوک کیا گیا کہ عبادت گاہوں تک میں اس کے برہنہ مجسمے بنا کر رکھے گئے، اسے مذہبی تہواروں پر دریاؤں اور تالابوں کے کنارے برہنہ غسل پر مجبور کیا گیا اور اسے یہ تصور دیا گیا کہ اس سے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ المختصر ہندو تہذیب نے عورت کو ذلت اور پستی کے ایسے گڑھے میں پھینکا، جس سے اس کا نکلنا ناممکن ہے۔(۴)

القصہ بیشتر تہذیبوں میں طبقۂ نسواں کی کوئی توقیر تھی نہ کوئی قدر و وقعت، اسے کسی معاشرے میں کوئی آبرومندانہ مقام حاصل تھا نہ وہ کسی شمار قطار میں آتی تھی۔ اندریں حالات آفتابِ اسلام طلوع ہوا اور

اس کی شعاعوں سے تمام عالم منور ہوگیا۔اسلام نے عورت کو ظلم کے بھنور سے نکالا اور مردوں کے استحصال سے بچایا۔اسلام نے زمانے کی چلچلاتی دھوپ میں عورت کے سر پر اپنی رحمت کا سائبان تان دیا۔ دینِ برحق نے اسے جملہ غصب شدہ حقوق عطا کیے، اسے عزت بخشی اور اعلیٰ مقام انسانیت سے سرفراز کیا، جس کی وہ خلقی طور پر حق دار اور زمانۂ قدیم سے آرزومند تھی۔اس ضمن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول قابلِ ذکر ہے:

وَاللّٰہِ اِن کُنَّا فِیْ الجاھلیۃ مَا نَعُدُّ لِلنِّساءِ اَمراً حَتّٰی اَنْزَلَ اللّٰہ فیھِنَّ مَا اَنْزَلَ وَ قَسَمَ لَھُنَّ مَا قَسَم (صحیح المسلم، جلد اول، کتاب الطلاق، ص ۴۸۱)

''خدا کی قسم ہم جاہلیت میں خواتین کو کوئی وقعت نہ دیتے حتیٰ کہ اللہ نے ان کے متعلق جو احکام نازل کرنا تھے، کر دیے اور جو حصہ مقرر کرنا تھا کر دیا۔''

اسلام دیگر مذاہب عالم کے برعکس ایک جامع اور متوازن دین ہے؛ جس نے اپنے ماننے والوں کے لیے ایک جامع و مکمل ضابطہ حیات وضع کیا؛ جس کے مطابق عورت کو وہ جملہ معاشی، سماجی اور تہذیبی حقوق ودیعت ہوتے ہیں جو مرد کو حاصل ہیں تا کہ معاشرے میں عدل وانصاف کا قیام عمل میں آسکے۔

طبقۂ نسواں کو اسلام کی طرف سے تفویض کردہ حقوق مندرجہ ذیل ہیں:

زندگی کا حق، پرورش کا حق، حصول علم کا حق، نکاح کا حق، حق وراثت، نان ونفقہ، حق مہر، کاروبار اور آزادیِ عمل کا حق، آبرو کا حق، تنقید واحتساب کا حق و دیگر حقوق۔

سید جلال الدین عمری نے اپنی کتاب میں اسی موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ احسان اسلام کا ہے۔سب سے پہلے اسلام نے عورت کو وہ حقوق دیے، جن سے وہ عرصۂ دراز سے محروم چلی آرہی تھی۔ یہ سارے حقوق اسلام نے اس لیے نہیں دیے کہ عورت ان کا مطالبہ کررہی تھی یا اس کا احتجاج اپنے حق کے لیے جاری تھا اور اس کے حقوق کی وکالت اور نمائندگی ہو رہی تھی بلکہ اس لیے دیے کہ عورت کے یہ فطری حقوق تھے اور اسے ملنا ہی چاہییں تھے۔اسلام ان حقوق کے دینے پر مجبور نہیں تھا بلکہ اس لیے دیے کہ عورت مظلوم تھی اور مظلوم کی حمایت کو وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔''(۵)

اسلام دینِ فطرت ہے سو اس نے نظامِ فطرت کے مطابق مرد وزن کے حقوق وفرائض مرتب کیے اور قوانین معاشرت تشکیل دیے ہیں۔اس نے مغرب کے نظام کے برعکس طبقۂ نسواں کو مادر پدر آزادی دینے کی بجائے راہِ اعتدال اختیار کرتے ہوئے اس کی جسمانی ساخت، طاقت، طبیعت اور نفسیات کے مطابق حقوق عطا کیے ہیں۔ یہاں حقوق نسواں کا تصور، مغرب کے غیر فطری و غیر متوازن تصور سے مختلف اور سوسائٹی میں امن وسلامتی کا مظہر ہے۔اسلام عورت کی ہمہ جہتی ترقی کی باقاعدہ ضمانت بھی دیتا ہے اور

حقوق وفرائض میں عدم توازن وعدم تناسب کے سبب پیدا ہونے والی خرابیوں اور قباحتوں سے سوسائٹی کو محفوظ بھی رکھتا ہے، جن سے مغربی معاشرہ فی زمانہ دوچار ہے۔

لیکن مقام افسوس ہے کہ جب دنیا میں اہلِ اسلام سیاسی طور پر تنزل پذیر ہوئے اور تعلیمات دینیہ سے لاتعلقی کے باعث تہذیبی اقدار و روایات سے تہی دامن ہو گئے تو عورت بھی اپنا معاشرتی مقام کھو بیٹھی اور اپنے بنیادی حقوق سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ نیز جب مرد و زن کے حقوق وفرائض کی تعیین میں اعتدال وتوازن قائم نہ رہا تو طبقۂ نسواں زیادہ متاثر ہوا۔ عورت اس مقام سے گر گئی جو بجا طور پر اس کے شایانِ شان تھا، عورت کے چاروں مقدس رشتے (ماں، بہن، بیٹی، بیوی) بے توقیر ہو گئے۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ایک طرف مغرب میں عورت کو اسلامی تقلید میں غصب شدہ انسانی حقوق سے نوازا گیا تو دوسری طرف مشرق میں وہ اسلام کے تفویض کردہ حقوق سے محروم ہو گئی۔ بالخصوص ہندوستان میں خواتین کا طبقہ جو یہاں مسلمانوں کی آمد سے پیشتر بھی ہر لحاظ سے پس ماندہ تھا، ایک بار پھر سیاسی وتہذیبی زوال کے بعد زبوں حال ہو گیا۔ یہاں مسلمان عورت کی حالت، ہندو عورت کی سماجی حالت سے کوئی بہتر نہ تھی۔ اگر انتہا پسند ہندو اپنی خواتین سے ہتک آمیز اور ظالمانہ سلوک کرتے تھے تو بعض مسلمان بھی، ان کی صحبت اور ہمسائیگی کے سبب ان سے چنداں مختلف نہ تھے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان اور ہندو صدیوں اکٹھے رہے، پوری پوری زندگی ایک جگہ گزار دی، دونوں کا آپس میں لین دین اور ہمسایگانہ تعلق رہا۔ پس جس طرح بعض معاملات میں ہندو، مسلمانوں سے اثر پذیر ہوئے تو اسی طرح لا محالہ مسلمان بھی ہندوؤں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اقتصادی معاملات ہوں یا سماجی، مسلمانوں نے ہندو قوم سے گہرا اثر قبول کیا۔ انھوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر غیر قوم کے طور طریقے بھی اپنائے اور رسم و رواج بھی اختیار کیے۔ طبقۂ نسواں کے متعلق ان کی سوچ اور رویہ وہی تھا جو ان کے ہمسایوں کا تھا۔ انھوں نے قرآنِ حکیم میں مرقوم یہ حکم خداوندی فراموش کر دیا:

عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (النساء:۱۹)

مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشاداتِ عالیہ سے بھی اعتنا نہ کیا:

خَيْرُكُم، خَيْرُكُم لِاَهْلِهٖ وَاَنَا خَيْرُكُم لِاَهْلِي (جامع ترمذی، جلد۲، ابواب المناقب، ص ۷۰۹)

"تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل خانہ سے اچھا ہے اور میں اپنے اہل خانہ سے سب سے اچھا ہوں۔"

رويدأ سوقك بالقوارير (صحیح مسلم جلد۲، کتاب الفضائل، باب رحمتہ صلی اللہ علیہ وسلم النساء وامرہ بالرفق بھن، ص ۲۵۵)

''شیشوں کو ذرا سنبھال کر لے چلو۔''

اَلدُّنیامتاعٌ وَ خَیْرُ متاعِ الدنیا المراءۃُ الصَّالحۃُ (صحیح المسلم، جلداول کتاب الرضاع، حدیث 1467#،ص ۴۷۵)

''دنیامتاع ہےاور نیک عورت دنیا کی بہترین متاع ہے۔''

حُبِّبَ اِلَیَّ مِن الدُّنیا اَلنِّساءُ والطیب (نسائی، کتاب عشرۃ النساء، باب حب النساء، المجلد الثانی، ص۹۳)

''دنیا میں مجھےعورت اورخوشبو پسند ہے۔''

قرآن و حدیث کےعربی میں ہونے کے سبب عوام احکام وتعلیمات سے بیگانہ تھے۔ایسی ہی صورتِ حال میں حالؔی نے ضرورت محسوس کی کہ شاعری کے ذریعے سےعورتوں کےحقوق بیان کیے جائیں اور زوال آمادہ معاشرے میں مردوں کو مؤثر طریقے سے خواتین کی قدر و وقعت ذہن نشین کرائی جائے۔ واضح رہے کہ خواجہ الطاف حسین حالؔی شعر کی تاثیر اور افادیت کے قائل تھے جس کا ذکر انھوں نے مقدمہ شعروشاعری میں بھی کیا ہے اور مسدس مدوجزر اسلام کے دیباچے میں بھی، نثر کے مقابلے میں نظم کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے اور شاعری کو معاشرے کی اصلاح وترقی کے لیے مفید وکارآمد قرار دیا ہے۔

مولانا حالؔی کا مطالعہ بھی وسیع تھا اور اپنے معاشرے کا مشاہدہ بھی بہت گہرا تھا۔انحطاط پذیر ہندوستانی معاشرے میں عورت کی پس ماندگی اور زبوں حالی سے حالؔی مکمل طور پر آگاہ تھے۔سواس سے متعلق اپنے احساسات، تاثرات اور خیالات کومولانا حالؔی نے سادہ مگر پراثر وپُر درواندازمیں بیان کیا۔ان کے اعلیٰ خیالات شریف عورتوں کے متعلق ''چپ کی داد'' اور ''مناجاتِ بیوہ'' کی صورت میں ظاہر ہوئے جو نہایت مؤثر اور دلکش نظمیں ہیں۔(۶) یہ نظمیں حالؔی کی ہندوستانی خواتین سے ہمدردی اوران کی اصلاحِ احوال کی کوشش کی بے لاگ عکاس ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالؔی نے اپنی شاعری میں ہر طبقہ معاشرہ کوموضوع بنایا ہے تاہم حقوق نسواں ان کا خاص موضوع رہا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں عورت کی معاشرتی حالت بہت ہی خستہ اور ناگفتہ بہ تھی جومولانا کے لیے تحریک اور تصنیف کا سامان بنی۔اس موضوع پر مولوی عبدالحق یوں رقمطراز ہیں:

> ''مولانا کمزوروں اور بےکسوں کے بڑے حامی تھے۔خاص کرعورتوں کی جو ہمارے ہاں سب سے بےکس فرقہ ہے، انھوں نے ہمیشہ حمایت کی۔''مناجاتِ بیوہ''اور''چپ کی داد'' یہ دوایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں تو کیا، ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرع سے خلوص، جوش ہمدردی اوراثر ٹپکتا ہے۔یہ نظمیں نہیں،

دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔لکھنا تو بڑی بات ہے کوئی انھیں بے چشم نم پڑھ بھی نہیں سکتا۔"(۷)

مولانا حالؔی ایک دردمند اور صاحب دل آدمی تھے جو اپنے دل میں خواتین کے مجبور اور مفلوک الحال طبقے سے بہت ہمدردی رکھتے اور اس کی خستگی و پس ماندگی کو بہبود و ترقی سے بدلنے کے خواہاں تھے اور شعر کو ایک کارگر ہتھیار بنا کر ان کے احوال کی اصلاح اور معاشرے میں انھیں کھویا ہوا آبرومندانہ مقام دلانے کے لیے مسلسل کوشاں تھے۔

ان کی نثری تصنیف "مجالس النساء" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ،جس میں عورت کی تعلیم وتربیت، حسن معاشرت، آداب حیات، آمرزش دست کاری اور امور خانہ کو موضوع بنایا گیا ہے اور متذکرۂ بالا دو نظمیں بھی اسی نظریے کی عکاس ہیں کہ ہندی سماج میں عورت کی تمدنی حالت بہت ابتر ہے اور اسے سدھارنے کی بہت ضرورت ہے، یہی تقاضائے وقت ہے۔

انھی نظموں کے متعلق شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اپنی تصنیف، تذکرہ حالی میں اپنے خیالات کا اظہار اس پیرایے میں فرمایا ہے:

"مناجات بیوہ" ۱۸۸۶ءیا ۱۸۸۷ءکی تصنیف ہے۔ یہ بے نظیر نظم مولانا کی بہترین نظموں میں سے ہے اور مولانا کو خود بھی اس پر بجا ناز تھا۔آج تک کوئی شخص ہندوستان کی بدنصیب اور نامراد بیوہ کے جذبات و خیالات کو اس روانی و خوبصورتی سے نظم نہیں کر سکا تھا، جیسا مولانا نے کیا۔مسدس کے بعد شہرت کے لحاظ سے اگرچہ "مناجات بیوہ" کا دوسرا درجہ ہے مگر زبان کی سلاست، مصرعوں کی بندش اور خیالات کی روانی اور پھراثر اور درد کے لحاظ سے "مسدس" اس مثنوی تک مشکل ہی سے پہنچ سکتی ہے۔ دس سے زیادہ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔"(۸)

اس نظم کی مقبولیت کیوں نہ بڑھتی ؟ جس ادب پارے کا موضوع عوامی ہوگا اور وہ جمہور کے سلگتے ہوئے مسائل کا ترجمان ہوگا تو عوام میں اس کی پسندیدگی اور پذیرائی تو یقیناً ہوگی۔معاشرے کے خواندہ لوگ اسے پڑھیں گے، سراہیں گے اور حسنِ قبول سے نوازیں گے۔یہی بات رام بابو سکسینہ نے 'تاریخ ادب اردو' میں بیان کی ہے:

"یہ چھوٹی سی عجیب وغریب کتاب (نظم) مولانا کی، ہمارے نزدیک "مسدس" اور "شکوہ" سے بھی زیادہ مطبوع خلائق ہے۔مناجات بیوہ میں بیوہ عورتوں کی دردناک حالت اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ اس کو پڑھ کر یا سن کر دل پھٹ جاتا ہے، اس کا ترجمہ اکثر

زبانوں میں ہو چکا ہے۔اس کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے:اس کو پڑھتے وقت اکثر
شوہر دار عورتیں کہتی ہیں کہ کاش ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے۔''(۹)

رام بابو سکسینہ کی طبقہ نسواں کی طرف سے مذکورہ جذباتی رائے بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے اور اسے مبالغہ آرائی پر محمول کیا جا سکتا ہے بایں ہمہ خواجہ الطاف حسین حالؔی نے مرد ہو کر جس موضوع کا انتخاب کیا اور اسے جس اسلوب میں بیان کیا ہے، اپنی مثال آپ ہے۔''مناجاتِ بیوہ'' کے اشعار میں حالؔی نے اپنے خیالات واحساسات سے زیادہ ایک بیوہ عورت کے جذبات کی ترجمانی کی ہے جسے انسانوں سے کوئی سہارا نہیں مل سکا اور اس کا بدل وہ خدا کے ایسے تصور میں تلاش کرتی ہے جو ایک مہربان مگر ذرا سخت گیر باپ کے تصور سے زیادہ قریب ہے اور حالؔی کے انسانی زندگی سے شدید تعلق اور مناسبت کا آئینہ دار ہے۔(۱۰)

معاشرے میں کسی بیوہ کی کیفیت اور رنج وغم کے متعدد پہلو ہو سکتے ہیں لیکن حالؔی نے خصوصیت سے جس چیز پر زور دیا ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا میں عام عورتیں جس طرح زندگی بسر کرتی ہیں، وہ بیوہ کو حاصل نہیں، گویا حالؔی کے نزدیک زندگی کی تکمیل اس بات میں ہے کہ آدمی دوسرے آدمیوں کی سی زندگی بسر کر سکے اور زندگی کی گوناگوں سرگرمیوں میں حصہ لے سکے۔(۱۱)

حساس موضوع اور اس کے مناسبات ومتعلقات کو حالؔی نے پُر درد وپُر اثر پیرایہ اور دل آویز اسلوب میں بیان کیا ہے۔اسی موضوع پر صالحہ عابد حسین رقمطراز ہیں:

''حالؔی نے اس نظم کے لیے انداز بیان بھی وہ اختیار کیا ہے جس سے زیادہ موزوں اور موثر طرز بیان اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ایک سماج کی ٹھکرائی ،مصیبت کی ماری، ستم زدہ بیوہ، جس کی دنیا میں نہ کہیں داد ہے نہ فریاد، سوا اپنے پالن ہار، کے اور کس سے شکوہ کر سکتی ہے؟ کس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ سکتی ہے؟ وہ اسی سے اپنی دردناک حالت بیان کرتی ہے، شکایت کرتی اور دعا کرتی ہے۔ایک ایک شعر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل کو چیر کر نکلا ہے اور قاری کے دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔''(۱۲)

نظم کا ہر بیت، ہر شعر بیوہ کی حزنیہ کیفیات اور المیہ واردات کا بیان اور دردناک تاثرات کا ترجمان ہے:

اے مرے زور اور قدرت والے
حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دُکھیاری
دروازے کی تیرے بھکاری

موت کی خواہاں، جان کی دشمن
جان پہ اپنی آپ اجیرن
سہ کے بہت آزار چلی ہوں
دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے
منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
تجھ پہ ہے روشن سب دکھ دل کا
تجھ سے حقیقت اپنی کہوں کیا
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے
لینے کے یاں پڑ گئے دینے
خوشی میں بھی سکھ پاس نہ آیا
غم کے سوا کچھ راس نہ آیا
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے
ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
چین سے رہنے دیا نہ جی کو
کر دیا ملیامیٹ خوشی کو
دن ہیں بھیانک رات ڈرانی
یوں گزری یہ ساری جوانی
آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا
کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا
سیلانی جب باغ میں آئے
پھول نہ تھے کھلنے ابھی پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں
جا سوئے سیلانی بن میں

واضح ہو کہ کسی بھی معاشرے میں عورت کی بیوگی ایک سنگین واقعہ اور المیہ ہے تاہم اگر کوئی عورت بڑھاپے میں بیوہ ہو جاتی ہے تو وہ کوئی زیادہ اندوہ گیں واقعہ متصور نہیں ہوتا کہ مرنے والا اپنی عمر پوری کر چکا

اور جملہ فرائض سے عہدہ برآ بھی ہو چکا؛ بیوہ بھی اپنی زندگی کی بہاریں دیکھ چکی اور اب وہ چشم براہِ آخرت ہے۔ بخلاف ازیں نوجوانی ہی میں بیوگی قسم قسم کے مسائل اور طرح طرح کی مشکلات اور حرماں نصیبوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ نوجوان بیوہ کے لیے بقیہ زندگی گمبھیر سماجی مسائل کا مجموعہ بن جاتی ہے ایک طرف معاشی و سماجی مسائل تو دوسری جانب، جبلی تقاضے اور طبعی خواہشات۔ ہر چند ہر انسان کے جذبات بھی ہوتے ہیں اور خواہشات بھی۔ تاہم بیوہ بعض جبلی تقاضوں اور خواہشوں کو شدت سے محسوس کرتی ہے۔ دیکھیے کہ الطاف حسین حالؔی نے ایک بیوہ کے جذبات اور جبلی خواہشات کو کتنے موزوں انداز میں بیان فرمایا ہے:

گھر برکھا اور پیا بدیسی
آئی برکھا کہیں نہ ایسی
شرط سے پہلے بازی ہاری
بیاہ ہوا اور رہی کنواری
خیر سے بچپن کا ہے رنڈاپا
دور پڑا ہے ابھی رنڈاپا
عمر ہے منزل تک پہنچانی
کاٹنی ہے بھرپور جوانی

یہ انسان کی نفسیات میں شامل ہے کہ جب کسی حادثہ سے دوچار ہوتا ہے یا اسے کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو وہ خدا سے رجوع کرتا ہے اور بعض اوقات شکوہ کناں بھی ہوتا ہے۔ بیوہ بھی اپنے بخشندہ و مہربان خدا سے رجوع کرتی اور شکوہ کناں ہوتی ہے تاہم تقاضائے ادب بہر کیف ملحوظ خاطر رکھتی ہے اور منہ سے شرر باری نہیں کرتی:

دین سے تیری اے میرے مولا!
سب ہیں نہال ادنیٰ اور اعلیٰ

سب کو ترے انعام تھے شامل
میں ہی نہیں انعام کے قابل؟
پہروں سوچتی ہوں یہ جی میں
آئی تھی کیوں میں اس نگری میں

آن کے آخر میں نے کیا کیا؟
مجھ کو مری قسمت نے دیا کیا؟
رہی اکیلی بھری سبھا میں
پیاسی رہی بہتی گنگا میں
چین گر اپنی بانٹ میں آتا
کیوں تو عورت ذات بناتا
کیوں پڑتے ہم غیر کے پالے
کیوں ہوتے اوروں کے حوالے
دکھ میں نہیں یاں کوئی کسی کا
باپ نہ ماں، بھائی نہ بھتیجا
سچ یہ کسی سائیں کی صدا تھی
سکھ سمپت کا ہر کوئی ساتھی

مرد وعورت کی شادی ایک شرعی وقانونی ازدواجی بندھن ہوتا ہے جو بقائے نسلِ انسانی کے لیے لازم ہے۔اس مقصد سے اولاً رشتہ دیکھنے دکھانے اور جانچنے کا عمل ہوتا ہے جو بعض صورتوں میں طول بھی پکڑ لیتا ہے۔یہ ادق مرحلہ طے ہونے کے بعد برسوں شادی کی تیاریاں کی جاتی ہیں اور سہانے خوابوں کے تاج محل بنائے جاتے ہیں لیکن جب شوہرِ قسمت سے تاج محل بن کر گر جاتے ہیں، وہ جاں گسل لمحہ قیامت سے کم نہیں ہوتا۔کسی لڑکی کی شادی ہوتے ہی بیوہ ہو جانا،افسوس ناک ہے جو اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور کربناک ہے مگر اس کے کرب وغم کو وہی جانتی ہے،کوئی دوسرا اس کے دکھ کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے نہ کوئی مداوا۔نوجوانی میں بیوگی، بیوہ کے لیے ایک طویل اور مشکل امتحان ہے،جس میں کامیاب ہونا سہل نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ جس طرح بیوہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہوئے جبلی تقاضوں کو دبانا اور نفسانی خواہشوں کو سلانا مشکل عمل ہے،اسی طرح اس عمل کی شعروں میں موثر ترجمانی یا جذبات نگاری بھی ایک مشکل امر ہے لیکن حالؔی نے یہاں بھی فنکاری وچابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے۔

کان اور آنکھیں ، ہاتھ اور بازو
جن جن پر تھا، یاں مجھے قابو
سب کو بدی سے میں نے بچایا
سب کو خودی سے میں نے ہٹایا

اٹھتے بیٹھتے، روکا سب کو
سوتے جاگتے ٹوکا سب کو
روک کے یوں اور تھام کے آپا
میں نے کاٹا اپنا رنڈاپا

لیکن جذبات دبائے نہیں دبتے اور خواہشیں مٹائے نہیں مٹتیں ۔ بیوہ کے جذبات بھی ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے شوہر دار عورتوں کے، بیوہ کا دل بھی اسی طرح محبت اور رفاقت کا طلبگار رہتا ہے، جس طرح سہاگنوں کے دل:

حال کروں میں دل کا بیاں کیا
حال ہے دل کا تجھ سے نہاں کیا
دھوپ تھی تیز اور ریت تھی تپتی
مچھلی تھی اک اس میں تڑپتی
جان نہ مچھلی کی تھی نکلتی
اور نہ سر سے دھوپ تھی ٹلتی

بیگم صالحہ عابد حسین نے ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں کتنی مکمل تشبیہ ہے! کس لطافت اور اشاریت سے نوجوان بیوہ کی تڑپ، طلب اور بے بسی کا مرقع کھینچ دیا ہے۔(۱۳)

گو دم بھر اس دل کی لگی نے
ٹھنڈا پانی دیا نہ پینے

.....

تو ہے مگر اس بات کا دانا
میں نے کہا دل کا نہیں مانا

تقدیر کے ہاتھوں مجبور اور قسمت سے محروم نوجوان عفیفہ اسی میں اپنی عافیت سمجھتی ہے کہ وہ اپنی باقی ماندہ جوانی اور زندگانی، اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر میں بسر کر دے:

چاہتی ہوں اک تیری محبت
اور نہیں رکھتی کوئی حاجت
دل میں لگن بس اپنی لگا دے
سارے غم اپنے غم میں کھپا دے

بیگم صالحہ عابد حسین اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''بچپن کی شادی کی لعنت اور بیوہ کی شادی کی مخالفت جو ہندوستان کی تہذیب پر ایک بدترین داغ ہے، جس نے کروڑوں معصوم زندگیاں تباہ و برباد کردیں۔ ان مذموم رسموں کے خلاف سب سے پہلی آواز جو بلند ہوئی، وہ حالؔی کی تھی۔ یہی آواز تھی جو بعد میں اصلاحِ رسوم واصلاحِ معاشرت کی صورت میں مہاتما گاندھی کے گلے سے نکلی تھی۔۔۔ بحیثیت مجموعی ''مُسدّس'' کی عظمت اور اہمیت بہت زیادہ ہے لیکن بعض لحاظ سے میری نظر میں ''مناجات'' کا درجہ مسدس سے بھی زیادہ بلند ہے۔'' (۱۴)

''مناجاتِ بیوہ'' کے بعد خواجہ الطاف حسین حالؔی کی ایک دوسری نظم ''چپ کی داد'' ہے جو ہندوستان کی ستم رسیدہ اور مظلوم عورت کے احوال کی خوبصورت ترجمانی کرتی ہے۔ مولانا حالؔی نے مذکورہ نظم میں خواتین کے مؤثر کردار اور خدمات کو جس طرح سے بیان کیا ہے، قابلِ ستائش ہے۔ ان سے قبل اس موضوع پر کسی ادیب کا قلم متحرک ہوا نہ کسی شاعر نے کوئی نظم لکھی۔ حالؔی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عشق و تعشق کے مضامین بیان کرنے کی بجائے خواتین کے معاملات و مسائل کو موضوعِ سخن بنایا اور فرسودہ روش پر چلنے کی بجائے طریقِ نو اختیار کیا۔ اسی ضمن میں صالحہ عابد حسین نے ''یادگارِ حالؔی'' میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حالؔی سے پہلے اردو شاعری میں عورت کا کوئی خاص مقام نہ تھا۔ اس کا ذکر آتا بھی ہے تو محض محبوب کی حیثیت سے اور وہ بھی کوئی اونچے کردار کی حامل نہیں ہوتی بلکہ اس کی حرکتوں میں شریف عورت سے زیادہ طوائف جھلکتی ہے۔ اس کی اصلی صفات ایثار، قربانی، جفاکشی، محنت، وفا، پرستش، محبت و خدمت کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے اس کا جو بلند کردار ساری دنیا کی تاریخ میں عموماً اور ہندوستان کی تاریخ میں خصوصاً رہا ہے۔ اس کا اشارہ بھی شاید ہی کہیں ملے۔ کوئی بدیسی اگر ہمارے اس وقت کے سارے اردو شاعری کے خزانے کو کھنگالے تو اس کو یہ رائے قائم کرنی پڑے گی کہ اس قوم میں عورت کا نہ کوئی درجہ ہے نہ اخلاق، نہ اہمیت ہے نہ کوئی حیثیت۔۔۔ لیکن حالؔی نے اس عظیم غلطی کی تلافی کی اور اردو شاعری میں ہندوستانی عورت کو اس شان سے جلوہ گر کیا کہ ساری پچھلی فروگزاشتوں کی تلافی کر ڈالی۔ وہ جہاں کہیں عورت کا ذکر کرتے ہیں، اسے انسانیت کے بلندترین مقام پر جگہ دیتے نظر آتے ہیں۔ ''چپ کی داد'' ان کی مشہور نظم ہے جس میں انھوں نے ہندوستانی عورت کی سیرت اور خدمات پر روشنی ڈال کر ان محرومیوں اور حق تلفیوں

کا ذکر کیا ہے جو اس کے ساتھ روا رکھی جاتی تھیں۔ ذرا چند بند دیکھیے۔ کس جوش اور خلوص سے عورت کی فطری صفات کی ثنا خوانی کرتے ہیں محبت و احترام لفظ لفظ سے ٹپک رہا ہے۔"(۱۵)

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں، قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھروں کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں ، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ، ایمان سلامت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا، انسان عبارت تم سے ہے
مونس ہو خاوندوں کی تم، غمخوار فرزندوں کی تم
تم بن ہے گھر ویران سب، گھر بھر کی برکت تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی، ڈھارس ہو تم بیکار کی
دولت ہو تم نادار کی، عسرت میں عشرت تم سے ہے

زیرِ مطالعہ نظم ہشت پہلو ہے، جس میں مولانا حالؔی نے عورت کے متعدد روپ دکھائے ہیں اور ہر روپ بہت حسین وجمیل اور دل پذیر ہے۔ حالؔی نے خواتین کی مختلف صورتوں کو اس چابکدستی سے پیش کیا ہے کہ ایک دلکش سراپا نگاہوں کے سامنے لہرانے لگتا ہے۔

میکے میں عورت کا بطور بیٹی اور بہن کے، اطاعت شعارانہ کردار ملاحظہ کریں:

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم
پر سارے کنبے کی رہیں بچپن میں خدمت گار تم
ماں باپ کے حکموں پہ پتلی کی طرح پھرتی رہیں
غم خوار باپوں کی رہیں، ماؤں کی تابعدار تم

اور جب یہی عورت شادی کے بعد خاتونِ خانہ بن کر سسرال پہنچی تو وہاں کیا کیا مسائل پیش آتے ہیں اور کیا کیا برداشت کرنا پڑتا ہے:

واں فکر تھی ہر دم یہی، ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش سے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم

پالا بُروں سے گر پڑے، بد خو ہوں سب چھوٹے بڑے
چتون پہ میل آنے نہ دو، گو دل میں ہو بیزار تم

اور جب تخلیق انسانی کے بعد وہ ماں بننے کا شرف حاصل کرتی ہے تو:

کھانا پہننا، اوڑھنا، اپنا گئیں سب بھول تم
بچوں کے دھندے میں تمہیں اپنی نہ کچھ سدھ بدھ رہی
کی ہے مہم جو تو نے سر، مردوں کو اس کی کیا خبر
جانے پرائی پیڑ وہ، جس کے بوائی ہو پھٹی
پیدا اگر ہوتیں نہ تم، بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اٹھتے دو دن میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

اسی نظم میں مولانا حالؔی نے بطور مادر ایسا مرتبہ بھی بیان کیا ہے جو ان کے نزدیک صوفیا و اولیا، محققین و علما، غوث، ابدال اور انبیا سے بھی بلند تر ہے:

وہ دین اور دنیا کے مصلح کے جن کے وعظ و پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا دنیا میں نور حق عیاں
وہ علم اور حکمت کے بانی جن کے تحقیقات سے
ظاہر ہوئے عالم میں اسرار زمین و آسماں
کیا صوفیان باصفا، کیا اولیا، کیا انبیا
کیا عارفانِ باخدا، کیا غوث کیا، قطب زماں
سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے
کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے بسر
زیبا ہے گر کہیے تمہیں فخر بنی نوعِ بشر

لیکن مقام افسوس ہے کہ مردوں کے معاشرے نے عورت کے اخلاص، ایثار و محبت اور خدمات کا یہ صلہ دیا کہ اسے متعدد بنیادی حقوق سے محروم کر دیا۔ اس کا حقِ خدمت ادا کرنے کی بجائے اس سے حصول علم کا حق بھی چھین لیا جو اسلام نے اسے مرحمت کیا تھا:

جب تک جیو تم، علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر

جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سربسر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب
الخ

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستانی عورت کے حقوق کی حفاظت کی (اور یاد رکھیے کہ یہاں فقط مسلمان عورت کا سوال نہیں بلکہ ہندوستان کی ہر عورت کی حمایت پیشِ نظر ہے) سب سے پہلی آواز جس شخص نے بلند کی اور اس کی سماجی مظلومی کا علَم اٹھایا، وہ حالؔی ہی تھے۔(۱۶)

یہ تاریخ ادب اردو کی ایک حقیقت مسلمہ کہ جب اردو شعرا اپنی شاعری میں گل و بلبل اور شمع و پروانہ کے افسانے بیان کر رہے تھے اور رومان پرور فضا میں محوِ سیر تھے، دریں حالات، حالؔی نے روشِ کہن پر چلنے اور پامال و فرسودہ مضامین کو موضوعِ سخن بنانے کی بجائے اپنے وقت کے سُلگتے مسائل کو اپنی شاعری میں بیان کیا نیز سماجی مسائل و امور کے واسباب و عوامل کا تجزیہ کیا۔انھوں نے جس طرح سے شاعری میں حقوق نسواں اور دیگر سماجی معاملات کی ترجمانی کی، انھی کا حصہ ہے۔خواجہ الطاف حسین حالؔی نے ہندوستانی معاشرہ کی ابتر صورتِ حال کے سدھارنے کے لیے اپنی نظم کو مخصوص کیا اور اسے اصلاحِ احوال کا مؤثر ذریعہ بنایا، یہی ان کا خصوصی امتیاز ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) جلال الدین عمری، سید، اسلام میں عورت کے حقوق، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۵

(۲) جلال الدین عمری، سید، عورت اسلامی معاشرہ میں، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، لمیٹڈ، سولھواں ایڈیشن، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸

(۳) ایضاً، ص ۲۳

(۴) عبدالغنی، پروفیسر، اسلام کا معاشرتی نظام، لاہور: تاج بک ڈپو، ۱۹۸۶ء ص ۲۱۳، ۲۱۴

(۵) جلال الدین عمری، سید، اسلام میں عورت کے حقوق، ص ۲۶

(۶) رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، کراچی: غضنفر اکیڈمی، پاکستان، ص ۳۶۳

(۷) عبدالحق، مولوی، چند ہمعصر، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، چھٹا ایڈیشن، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۰

(۸) اسماعیل پانی پتی، شیخ، تذکرۂ حالی، لاہور: شجاعت پبلی کیشنز، س ن ص ۶۷
(۹) رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ص، ۳۶۴
(۱۰) حسن عسکری، انسان اور آدمی، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء، ص ۱۸۰
(۱۱) ایضاً، ایضاً، ص ۱۸۱
(۱۲) صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، میر پور، آزاد کشمیر: ارسلان بکس، س ن، ص ۱۸۱
(۱۳) ایضاً، ایضاً، ص ۱۸۳
(۱۴) ایضاً، ایضاً، ص ۱۸۵
(۱۵) ایضاً، ایضاً، ص ۱۷۵
(۱۶) ایضاً، ایضاً، ص ۹۷